**Fikr-e-Iqbal**
Vol 1 No 1, 2024
فکرِ اقبال

# Educational Reforms in the light Of Iqbal's Philosophy

## تعلیمی اصلاحات: فکر اقبال کی روشنی میں

**Abdul Rauf**
PhD Scholar, Department of Urdu, Riphah International University, Faisalabad Campus
**Correspondence:** abdulrauftabish@gmail.com

**Abstract**

Iqbal's philosophy is like a shining light for the Muslim Ummah. Through education, it does not limit human beings to only economic benefits, but guides them toward a purposeful, meaningful, and creative life. For Iqbal, education is not about memorizing words or collecting degrees, but a complete system that awakens the self, builds self-awareness, and inspires the desire to explore and master the universe. In his view, education is the power that shapes a person's character and guarantees the collective awakening and progress of the Muslim community. This paper will highlight the link between Iqbal's thought and educational reforms, showing how he closely studied both Eastern and Western systems of education. He admired the scientific progress and material comforts of the West, but also considered its lack of purpose and spirituality a serious weakness. He argued that true education should not only sharpen the mind and increase knowledge but also bring light to the heart and strength to the soul. That is why he supported an educational system that combined the guidance of the Qur'an and Sunnah with modern scientific research, so that it could help people achieve well-rounded excellence. This paper will also explain Iqbal's vision of education and his wisdom in guiding the youth. He wanted young people to stay connected to their cultural and religious roots, while also gaining practical skills, creativity, and a spirit of research. He believed the curriculum should nurture qualities like sacrifice, service to humanity, and leadership.

To achieve this, he outlined some core principles: purposeful education focused on character-building and self-awareness, spiritual and moral training that raises human dignity, a balance between reason and love that enlightens both the mind and the heart, and a teacher-student relationship that provides not just instruction but also training and moral guidance. This paper will also compare today's education system with Iqbal's vision, showing how far it has drifted from his ideals. Today's system is caught up in rote learning, chasing grades, and preparing for jobs, while ignoring moral training and real purpose. Our institutions may produce graduates, but not true leaders with wisdom and vision. This worrying situation shows the need to place Iqbal's thought at the center of education policy. The curriculum should be redesigned to combine religious and worldly knowledge, promote research and creativity, and prepare students to become true builders of the Muslim Ummah. This paper will make it clear that for Iqbal, the goal of education is not just material progress but also the spiritual, moral, and intellectual awakening of the Muslim community. If we take his ideas as our guide, we can create an education system that will lift the Ummah out of decline and lead it again toward progress and greatness.

**Keywords:**
Iqbal, Philosophy, Muslim Ummah, Education, Purpose, CreativityService, Teacher, Student, Progress, Awakening, Civilization

**Received:** 18-08-2024 **Accepted:** 02-11-2024 **Online:** 31-12-2024

Licensed under CC BY-NC 4.0 (Non-Commercial, Attribution).
2025 [Author]. All rights reserved.

تعلیم سے مراد انسان کے علم، کردار، فہم اور عمل کی ایسی ہم آہنگ تربیت ہے جو اسے معاشرے کا مفید اور باشعور فرد بناتی ہے۔ تعلیم محض معلومات کے حصول کا نام نہیں بلکہ شخصیت کی ہمہ گیر نشوونما، اخلاقی تربیت، فکری بالیدگی اور سماجی ذمہ داریوں کے شعور کا عمل ہے۔ تعلیم انسان کے ذہن، کردار اور عمل کو منظم کرتی ہے اور اسے درست سمت میں رہنمائی فراہم کرتی ہے۔

لفظ "تعلیم" عربی زبان کے مادہ "عَلَمَ ،یُعَلِّمُ ، تَعْلِیماً" سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ہیں کسی کو علم دینا، سکھانا، آگاہ کرنا یا رہنمائی فراہم کرنا۔ لغوی طور پر تعلیم کا مطلب ہے۔ کسی شخص میں علم، شعور اور ادراک پیدا کرنا تاکہ وہ خیر و شر میں تمیز کر سکے۔ اصطلاحی طور پر تعلیم ایک منظم، شعوری اور مسلسل عمل ہے جس کے ذریعے ایک نسل اپنی معلومات، اقدار، تجربات، روایات، مہارتوں اور ثقافتی ورثے کو دوسری نسل تک منتقل کرتی ہے۔ تعلیم محض علمی معلومات کا حصول نہیں بلکہ انسان کی شخصیت سازی، کردار سازی اور فکری تربیت کا نام ہے۔ تعلیم ایک ہمہ گیر و ہمہ جہت عمل ہے جو انسان کو نہ صرف دنیاوی فہم عطا کرتا ہے بلکہ اس کی روحانی و اخلاقی استعداد کو بھی نکھارتا ہے۔ یہ وہ عمل ہے جو فرد کو محض جاننے والا نہیں بلکہ سمجھنے والا، کرنے والا اور بدلنے والا انسان بناتا ہے۔

علامہ محمد اقبال کی فکری بیداری سے قبل برصغیر (پاک و ہند) کے تعلیمی حالات نہایت زوال پذیر اور انتشار کا شکار تھے۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد جب انگریز اقتدار میں آئے تو انہوں نے محض سیاسی غلبہ ہی نہیں بلکہ تعلیمی نظام کی اساس بھی تبدیل کر دی۔ مسلمان جو صدیوں تک علم، فنون، فلسفہ، منطق اور روحانی علوم میں پیش پیش تھے، اچانک تعلیمی میدان میں پسماندگی کا شکار ہو گئے۔ برصغیر میں مکتب و مدرسہ کا نظام طویل عرصے تک تعلیم کا بنیادی ذریعہ رہا ہے۔ اس میں قرآن، حدیث، فقہ، منطق، فلسفہ اور ادب کی تعلیم دی جاتی تھی۔

انگریزوں نے ۱۸۳۵ء میں لارڈ میکالے کے تعلیمی نظام کے ذریعے علم کا معیار اور مقصد بدل دیا۔ اپنی رپورٹ میں

میکالے (Macaulay) نے اپنا پورا زور قلم اس موقف پر صرف کیا کہ ہندوستان کا قدیم علم و ادب محض دقیانوسی اور بیکار ہے۔ لہٰذا کسی بھی مقامی زبان کے بجائے انگریزی زبان اور یورپی علوم کو ہندوستان میں نافذ کیا جائے۔ دراصل میکالے کی تعلیمی پالیسی کے کچھ مقاصد تھے، جس میں سب سے بڑا مقصد مقامی رعایا میں "خوئے غلامی" کو پختہ کرنا تھا۔ لارڈ میکالے (Lord Macaulay) اپنی رپورٹ میں لکھتا ہے:

> "We must at present do our best to form a class who may be interpreters between us and the millions whom we govern; a class of persons; Indian in blood and colour, but English in taste, in opinion, in morals and in intellect".(۱)

اس تعلیم کا مقصد "ایسے کلرک اور اہلکار تیار کرنا" قرار پایا جو انگریز حکومت کی خدمت کر سکیں۔ اس تبدیلی نے تعلیم کو روحانی و اخلاقی تعمیر کے بجائے مادی مفادات اور نوکری کے حصول تک محدود کر دیا۔ مسلمانوں نے ابتدا میں اس نظامِ تعلیم کو قبول نہیں کیا کیونکہ یہ ان کی دینی اور تہذیبی شناخت سے متصادم تھا۔ نتیجتاً وہ جدید تعلیمی اداروں سے دور ہو گئے اور رفتہ رفتہ علمی و سائنسی میدان میں پیچھے رہ گئے۔ ہندو قوم نے انگریزی تعلیم کو جلد اپنا لیا جس سے ان کے سیاسی اور معاشی مفادات میں اضافہ ہوا، جبکہ مسلمان زوال کی گہرائیوں میں چلے گئے۔

اقبال نے بھی اس طرزِ عمل کو محسوس کرتے ہوئے اپنی ایک نظم میں کہا:

تن بہ تقدیر ہے آج اُن کے عمل کا انداز
تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر(۲)

سر سید احمد خان نے جدید تعلیم کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے علی گڑھ تحریک کا آغاز کیا، تاکہ مسلمان جدید سائنسی علوم کے ساتھ اپنی دینی اساس کو بھی برقرار رکھ سکیں۔ تاہم اقبال سے پہلے تعلیمی میدان میں وہ فکری وحدت پیدا نہ ہو سکی جو تعلیم کو دین و دنیا، روح و عقل اور علم و عمل کے جامع رشتے میں جوڑ سکے۔ بقول ڈاکٹر محمد آصف اعوان:

> " معاشرہ جس قدر خواندہ ہو گا، اُسی قدر مہذب، ترقی یافتہ اور باشعور ہو گا، لیکن یہ اسی صورت ممکن ہے جب معاشرے کا تعلیمی نظام سماجی روایات کا آئینہ دار، دینی اور ثقافتی اصول و قواعد کا پاسدار اور قومی و ملی اُمنگوں اور احساسات کا امین ہو۔ جو قوم جس نظریہ حیات کی حامل اور پیرو ہوتی ہے، اُس کی بقا اور تحفظ بھی اُس کا اولین فرض ہوتا ہے۔ جس نظریہ حیات کی بقا اور تحفظ ہی کی خاطر اس بات کا اہتمام کیا جاتا ہے کہ ایک ایسا نظام تعلیم

وضع کیا جائے، جس کے ذریعے تصورِ حیات کے سیاسی، سماجی، دینی اور فکری پہلوؤں کو اس طرح اگلی نسل کے ذہن و قلب میں اُتارا جائے کہ وہ نہ صرف اسلاف کی اقدار و روایات کی امین بنے بلکہ ان اقدار و روایات کے مزید ابلاغ اور فروغ وارتقا کی ذمہ داری بھی اُٹھائے۔ گویا تعلیم دراصل اُس آدرش کی نمائندہ ہوتی ہے جسے کوئی قوم صدیوں اپنے سینے پالتی اور ارتقائی منازل سے گزارتی ہے۔"(۳)

اس وقت تعلیم یا تو محض دینی مکتب تک محدود تھی یا انگریزی مادیت کے زیرِ اثر بن چکی تھی۔ علم سے مقصدِ حیات کا شعور مفقود ہو چکا تھا۔ اقبال نے اسی زوال پذیر ماحول میں تعلیم کو روحِ ایمان، خودی، عمل اور تخلیقِ نو کے ساتھ جوڑ کر ایک نئی فکری سمت عطا کی۔ اس وقت برصغیر کا معاشرہ فکری، تہذیبی اور روحانی زوال سے دوچار تھا۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ ہی مسلمان اپنی سیاسی بالادستی، معاشی استحکام اور علمی میراث سے محروم ہو گئے۔ ایک اچھے نظام تعلیم کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ قومی شناخت کی حامل اقدار و روایات، زبان اور طرزِ معاشرت کو اگلی نسلوں تک منتقل کرنے کے عمل کو قائم و برقرار رکھتا ہے مگر بقول ڈاکٹر محمود حسین:

"اچھے نظام تعلیم کی عدم موجودگی میں معاشرہ اس وسیلہ سے محروم ہو جاتا ہے جو اُس کی میراث کا محافظ اور اُس کی حیات کا ضامن ہوتا ہے، فرد ہو یا قوم، دونوں کی زندگی میں ترقی کے زینے تعلیم ہی سے طے ہوتے ہیں۔"(۴)

اقبال اپنے مضمون "قومی زندگی" میں رقم طراز ہیں:

"قوموں کی بقا اُن کے افراد کی تعداد، ان کے زورِ بازو اور ان کے فولادی ہتھیاروں پر انحصار نہیں رکھتی بلکہ اُن کی زندگی کا دارومدار اُس کاٹھ کی تلوار پر ہے جو قلم کے نام سے موسوم کی جاتی ہے"(۵)

تعلیم کا مسئلہ ہر دور میں ایک نازک ترین مسئلے کی صورت بحث و نظر کا موضوع رہا ہے۔ اس مسئلے کی اہمیت نے ہر باشعور مفکر کو اس کے پیچ و خم کے بارے میں سوچنے پر مجبور کیا ہے۔ جب انگریز ہندوستان پر قابض ہو گئے تو وہ اس بات سے پوری طرح آگاہ تھے اور ان کا مقصد ایسی قوم جو ظاہری طور پر ہندوستانی مگر فکری و تہذیبی طور پر مغربی ہو۔ اس نظام نے تعلیم کو اخلاق، روحانیت اور دینی شعور سے الگ کر کے محض مادی ترقی کا ذریعہ بنا دیا۔ اس کے نتیجے میں تعلیم کا اصل مقصد یعنی انسان سازی،

کردار کی تطہیر اور فکری خود مختاری پس منظر میں چلا گیا۔ مدارس کا قدیم نظام جو قرآن، حدیث، فقہ، فلسفہ اور ادب کے امتزاج پر قائم تھا، جدید سائنسی تقاضوں سے نا آشنا رہ گیا۔ دوسری جانب انگریزی نظامِ تعلیم نے مذہب کو درسگاہوں سے خارج کر کے مادی اور سیکولر ذہنیت کو فروغ دیا۔ مسلمان طبقہ اس نئے نظام سے بد ظن رہا کیونکہ یہ ان کی اسلامی تہذیب، لسانی ورثے اور اخلاقی اقدار کے خلاف محسوس ہوتا تھا۔ مسلمان جدید تعلیمی اداروں سے دور رہے، جس سے ان کی معاشی، سیاسی اور علمی پسماندگی میں اضافہ ہوا۔ اس خلیج نے مسلمانوں میں احیائے تعلیم کی ضرورت کو اجاگر کیا۔ ان حالات میں سر سید احمد خان، مولانا شبلی نعمانی، اور مولانا محمد قاسم نانوتوی جیسے مفکرین نے اصلاحِ تعلیم کی تحریکیں شروع کیں۔ ان کا مقصد ایسا نظام پیدا کرنا تھا جو دینی روح اور جدید سائنسی شعور کو ہم آہنگ کر سکے۔ علی گڑھ تحریک، دارالعلوم دیوبند، اور ندوۃ العلماء کی بنیاد اسی فکری اضطراب کا نتیجہ تھیں۔

برصغیر پاک وہند کا تعلیمی نظام ایک تہذیبی بحران، فکری انحطاط اور روحانی خلا سے عبارت تھا۔ مسلمان قوم کو ایسی فکری قیادت درکار تھی جو تعلیم کو محض معاشی ضرورت نہیں بلکہ انسانی خودی، اخلاقی بیداری اور دینی شعور کے احیاء کا ذریعہ بن سکے۔

اقبال نے اس نظامِ تعلیم کو مسلمانوں کے خلاف ایک زبردست سازش قرار دیا:

اور یہ اہل کلیسا کا نظامِ تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین ومروت کے خلاف(۶)

اس نظامِ تعلیم کی ایک بڑی خامی یہ تھی کہ اس نے تعلیم کا مقصد محض ظاہری اور مادی فوائد کا حصول قرار دیا، اور کسی اعلیٰ اور روحانی نصب العین کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ جدید تعلیم نے نوجوانوں کو نمود ونمائش کا دلدادہ، عیش کوش، تن آساں اور آرام طلب بنا دیا۔ اقبال کہتے ہیں کہ تعلیم زرق برق لباس زیب تن کرنے، کلبوں میں حاضری دینے اور دخترِ رز سے آشنائی کرنے کا نام نہیں بلکہ:

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام
سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں(۷)

وہ نوجوانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

تیرے صوفے ہیں فرنگی، تیرے قالیں ہیں ایرانی
لہو مجھ کو رُلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی (۸)

عصرِ حاضر میں ملتِ اسلامیہ کو جن فکری اور عملی چیلنجز کا سامنا ہے، ان میں نظامِ تعلیم کا بحران سب سے زیادہ بنیادی اور دوررس نتائج کا حامل ہے۔ یہ بحران صرف تدریسی طریقوں یا نصاب کی فرسودگی تک محدود نہیں، بلکہ اس کا تعلق براہِ راست تعلیم کے مقصد، انسان کے تصور اور کائنات میں اس کے مقام سے ہے۔ جب تک تعلیم کا بنیادی فلسفہ درست نہ ہو، اس کی عملی صورتیں کسی پائیدار اور بامعنی تبدیلی کا سبب نہیں بن سکتیں۔ ایک ایسا نظام جو انسان کو اس کی روحانی جڑوں سے کاٹ دے اور اسے محض ایک معاشی آلہ کار بنادے، وہ بالآخر فرد اور معاشرے دونوں کی تباہی کا باعث بنتا ہے۔

"وہ (اقبال) برملا کہتے ہیں کہ جدید تعلیم نے مسلم نوجوانوں کا گلہ ہی گھونٹ دیا ہے۔ اب اس کی زبان سے نعرہ حق وصداقت بلند ہو تو کیسے ہو؟"

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ"(۹)

اسی فکری اور روحانی خلا کو پر کرنے کے لیے علامہ محمد اقبال نے اپنے فلسفۂ خودی کی بنیاد پر ایک ایسے نظامِ تعلیم کی داغ بیل ڈالی، جو انسان کو اس کی عظمتِ رفتہ سے آشنا کر کے اسے مستقبل کی تعمیر کے لیے تیار کرے۔

ایسی تعلیم جس کی بنیاد خدا اور اُس کے رسول ﷺ کے احکامات پر نہ ہو، مسلمانوں کے حق میں سمِ قاتل کا درجہ رکھتی ہے۔

مولانا محمد علی جوہر اپنی سوانح عمری میں رقم طراز ہیں:

"برطانوی حکومت مذہب کے معاملے میں مکمل غیر جانبدار ہونے کی مدعی تھی، اور اس دعویٰ کو اس نے عملی جامہ یوں پہنایا کہ سرکاری مدارس سے تمام مذاہب کی تعلیم کو بڑی سختی سے خارج کر دیا۔ حکومت کی طرف سے ہندوستان کی نئی نسلوں کے لیے جس تعلیم کا انتظام کیا جارہا تھا، اس کا تمام تر نقطہ نظر تخریبی لحاظ سے "جدید" تھا۔ یہ تعلیم طالبِ علم میں جسارت آمیز ہمہ دانی پیدا کرنے کا میلان رکھتی ہے اور اس کے ساتھ قومی و مذہبی روایات و مسلمات کا احترام بھی نہیں رہتا۔"(۱۰)

اقبال کا تصورِ تعلیم ایک جامع، مدلل اور حیات بخش فکری ڈھانچہ فراہم کرتا ہے، جس کا محور خودی کی حفاظت اور تقویت ہے، اور جس کا نصب العین مومن کی تخلیق ہے، جو نہ صرف مادی دنیا پر حکمرانی کرے بلکہ روحانی اقدار کا پاسبان بھی ہو۔ ان کی تعلیمات میں تعلیمی اصلاحات کا جو خاکہ ملتا ہے، وہ محض وقتی یا جزوی تبدیلیوں پر مبنی نہیں، بلکہ ایک مکمل انقلاب کی دعوت ہے جو فرد کی اندرونی دنیا سے شروع ہو کر بیرونی دنیا پر محیط ہو جاتا ہے۔

ایک حقیقی شاعر و مفکر کسی مروجہ نظام کا تابع نہیں ہوتا بلکہ وہ تقلید کے بجائے تخلیق کا پیامبر ہوتا ہے۔ اقبال نے مغربی تعلیم کے اثر سے پیدا ہونے والی اندھی تقلید کی سخت مزاحمت کی اور قوم کو خودی، فکری آزادی اور تہذیبی خود مختاری کا شعور بخشا۔

اقبال لکھتے ہیں:

پختہ افکار کہاں ڈھونڈنے جائے کوئی
اس زمانے کی ہوا رکھتی ہے ہر چیز کو خام
مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر
چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام(۱۱)
گرچہ مکتب کا جوان زندہ نظر آتا ہے
مردہ ہے، مانگ کے لایا ہے فرنگ کا نفس(۱۲)
آہ مکتب کا جوانِ گرم خوں
ساحر افرنگ کا صید زبوں(۱۳)

اقبال نے اپنے دور کے مروجہ نظام ہائے تعلیم کا گہرا اور تنقیدی جائزہ لیا۔ ان کی نظر میں، اس وقت دنیا میں دو بڑے تعلیمی دھارے موجود تھے: ایک مغربی نظامِ تعلیم جو ہندوستان میں غالب تھا، اور دوسرا قدیم دینی مدارس کا نظام۔ اقبال مغربی تعلیم سے سخت نالاں تھے، اور ان کا یہ گلہ کسی تنگ نظری یا علم دشمنی پر مبنی نہیں تھا، بلکہ اس کے بنیادی فلسفے پر تھا۔ وہ دیکھتے تھے کہ یہ نظام سراسر مادیت پر مبنی ہے، جو انسان کو صرف ظاہری دنیا کی تسخیر سکھاتا ہے، مگر اس کی باطنی اور روحانی دنیا کو ویران کر دیتا ہے۔ یہ تعلیم فرد کو ایک ایسا "علم" تو دیتی ہے جو اسے روزی کمانے کے قابل بنا دے، مگر وہ بصیرت اور جراتِ رندانہ چھین لیتی ہے جو انسان کو اللہ کے سامنے سرنگوں اور دنیا کے سامنے سربلند رکھتی ہے۔ مغربی تعلیم نے مسلمانوں کو اپنی تہذیبی اور

روحانی اقدار سے بیگانہ کر کے انہیں ذہنی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیا تھا۔ اس تعلیم کا حاصل صرف تقلید اور محکومی تھی، جس نے ایک ایسی نسل تیار کی جو اپنی تاریخ، اپنے فلسفے اور اپنے مقصدِ حیات سے کٹ کر رہ گئی۔

خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر
لبِ خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ
ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ(۱۴)

تعلیم ہر قوم کے فکری اور اخلاقی وجود کی بنیاد ہے۔ کسی بھی معاشرے کی ترقی اور فلاح اس وقت تک ممکن نہیں جب تک افراد کی خودی، شعور اور تخلیقی صلاحیتیں بیدار نہ ہوں۔ اقبال کے نزدیک تعلیم صرف معلومات حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں بلکہ انسان کی خود شناسی اور خودی کی تعمیر کا مرکزی عمل ہے اقبال کے نزدیک علم کی سب سے بڑی قدر یہ ہے کہ وہ انسان کو اپنی ذات کے راز سے روشناس کرے اور اسے فکر و عمل میں فعال بنائے، ورنہ علم محض ذہنی ذخیرہ بن کر بے اثر رہ جاتا ہے۔ یہ تصور کہ تعلیم فرد کی روحانی، اخلاقی اور فکری نشوونما کا ذریعہ ہو، موجودہ تعلیمی نظام کی خامیوں کی اصلاح کے لیے بنیادی بنیاد فراہم کرتا ہے۔

اقبال اپنے مقالے "ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر" میں رقم طراز ہیں:

> "مجھے رہ رہ کر یہ رنج دہ تجربہ ہوا ہے کہ مسلمان طالبِ علم اپنی قوم کے عمرانی، اخلاقی اور سیاسی تصورات سے نابلد ہے۔ روحانی طور پر ایک بے جان لاش کی مانند ہیں اور اگر موجودہ صورتِ حال اور بیس سال قائم رہی تو وہ اسلامی روح جو قدیم اسلامی تہذیب کے چند علم برداروں کے فرسودہ قالب میں ابھی تک زندہ ہے، ہماری جماعت کے جسم سے بالکل ہی نکل جائے گی۔ اور وہ لوگ جنھوں نے تعلیم کا یہ اصل الاصول قائم کیا تھا کہ ہر مسلمان بچہ کی تعلیم کا آغاز قرآن مجید کی تعلیم سے ہونا چاہیے وہ ہمارے مقابلے میں ہماری قومی کی ماہیت و نوعیت سے زیادہ باخبر تھے۔"(۱۵)

اقبال کی فکر میں خودی (Khudi) تعلیم کی اصل روح ہے۔ خودی کی بیداری کے بغیر تعلیم صرف معلوماتی عمل بن کر رہ جاتی ہے، جو نہ فرد کو مضبوط بناتی ہے اور نہ معاشرتی سطح پر موثر ثابت ہوتی ہے اس سلسلے میں نصاب اور طریقۂ تدریس دونوں پر غور ضروری ہے۔ نصاب ایسا ہونا چاہیے جو نوجوان کو سوال کرنے، تحقیق کرنے اور خود سے فکر و تدبر پیدا کرنے کی ترغیب

دے۔ حفظِ مضمونات کے بجائے تنقیدی سوچ، تخلیقی مشق اور عملی علم کو ترجیح دی جائے تاکہ طلبہ اپنی شخصیت سازی میں فعال کردار ادا کر سکیں۔

اقبال اپنے مخصوص فلسفیانہ اسلوب میں مغربی نظامِ تعلیم کی خامیوں کو بے نقاب کرتے ہیں۔ وہ خود اس نظام کی آگ سے کندن بن کر نکلے تھے، اس لیے اس کے ہر پہلو سے بخوبی آگاہ تھے۔ اقبال کے نزدیک تعلیم کا مقصد محض عقل و فن کی تربیت نہیں بلکہ روح کی بالیدگی اور کردار کی تعمیر ہے۔ وہ ایسی تعلیم کے خواہاں تھے جو انسان کے اندر دینی شعور، اخلاقی بصیرت اور عملی صداقت پیدا کرے، تاکہ وہ دنیاوی ترقی کے ساتھ اخروی فلاح بھی حاصل کر سکے۔ اقبال کے نزدیک حقیقی تعلیم وہی ہے جو انسان کو عبد بھی بنائے اور صاحبِ نظر بھی۔ چنانچہ اقبال کہتے ہیں:

"یورپ میں تعلیم کا خالصتاً دنیوی طریق بڑے تباہی آمیز نتائج پیدا کرنے کا موجب ہوا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میرا ملک کبھی ان تجربات سے دوچار ہو۔"(۱۶)

اقبال کے نزدیک استاد صرف علم پہنچانے والا نہیں بلکہ مربی، رہنما اور کردار سازی کا آلہ ہوتا ہے۔ استاد کو خودی کی بیداری حاصل ہونی چاہیے، تاکہ وہ طلبہ میں خود اعتمادی، شعورِ اختیار، اور اخلاقی شعور پیدا کر سکے۔ اقبال کی شاعری میں اس بات کی بار بار عکاسی ملتی ہے کہ استاد کی عظمت صرف علمی معلومات دینے میں نہیں بلکہ شخصیت کی تعمیر میں ہے اور اساتذہ کا کردار اس نظریاتی فریم ورک میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔

اقبال تعلیمی میدان میں وسیع تجربہ اور نظامِ تعلیم سے متعلق منفرد خیالات رکھتے تھے۔ وہ خود کہتے ہیں:

"آج کل کی طالب علمانہ زندگی سے چونکہ گذشتہ دس بارہ سال کی مدت میں مجھے سابقہ پڑتا رہا ہے اور میں ایک ایسے مضمون کا درس دیتا رہا ہوں، جس کو مذہب سے قریب کا تعلق ہے۔ لہٰذا میں اس بات کا تھوڑا بہت استحقاق رکھتا ہوں کہ میری باتیں مانی جائیں۔"(۱۷)

ان کی نظر میں، یہ علم صرف "فارغ التحصیل" تو پیدا کر سکتا تھا، مگر "صاحبِ کردار" پیدا کرنے سے قاصر تھا۔ اقبال اس بات پر رنجیدگی کا اظہار کرتے ہیں کہ جدید نظام تعلیم سے فارغ التحصیل نوجوان اسلام کے سپاہی بننے کے بجائے مغرب زدگی کا شکار نظر آتے ہیں۔

آہ! مکتب کا جوانِ گرم خوں
ساحرِ فرنگ کا صیدِ زبوں(۱۸)

دوسری طرف، اقبال قدیم دینی مدارس کے نظام سے بھی مکمل طور پر مطمئن نہیں تھے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا بیان ہے کہ:

"اپنے عہد کے نظامِ تعلیم پر اقبال کا بڑا اعتراض یہ بھی ہے کہ وہ لادینی ہے اور بے یقینی کے خیالات کو ہوا دیتا ہے۔"(۱۹)

اگرچہ اس نظام نے ملت کے روحانی ورثے کو کسی حد تک محفوظ رکھا تھا، مگر یہ جمود اور بے عملی کا شکار ہو چکا تھا۔ یہ نظام زندگی کے متحرک اور بدلتے ہوئے تقاضوں سے آنکھیں چرا رہا تھا اور صرف ماضی کی عظمتوں کے قصے سنا کر حال کی ذمہ داریوں سے غافل کر رہا تھا۔ اس تعلیم میں اجتہاد اور تخلیق کا عنصر مفقود تھا، اور یہ صرف فقہی موشگافیوں اور مذہبی رسومات تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ اقبال کے نزدیک، دین کا تصور ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جو مادی اور روحانی دونوں پہلوؤں پر محیط ہے۔ اقبال کے نزدیک تعلیم کا مقصد محض معلومات کی ترسیل نہیں بلکہ اسلامی نظریہ حیات اور پھر فروغ و ابلاغ اس کا بنیادی مقصد ہے۔ عبید اللہ فاروقی لکھتے ہیں:

"Education, according to Iqbal, is a means to an end and not an end itself. The end of education being Islamic ideology and culture".(۲۰)

مگر اس نظام نے دین کو صرف ایک گوشۂ عافیت بنا دیا تھا۔ اس طرح، دونوں نظام اپنی اپنی جگہ پر ناکام تھے: ایک نے روحانیت کو ختم کر دیا، اور دوسرے نے حیاتیت اور حرکت کو۔ اقبال کی تعلیمی اصلاحات کا نقطۂ آغاز دراصل ان دونوں انتہاؤں سے گریز اور ایک متوازن، متحرک اور روحانی طور پر با مقصد نظام کی تلاش ہے۔ اقبال کے تعلیمی فلسفے کا سب سے بنیادی اور مرکزی تصور خودی ہے۔ یہ محض غرور یا انا کا مترادف نہیں، بلکہ یہ انسان کے اندر موجود وہ الٰہی جوہر ہے جو اسے تمام مخلوقات سے ممتاز کرتا ہے اور اسے نائبِ حق کا مقام عطا کرتا ہے۔

تعلیم کا مقصد انسان کے اخلاق و کردار میں بہتری پیدا کرنا اور اُس کی عادات کو سنوارنا اور نکھارنا ہے۔ تعلیم یافتہ انسان اچھے بُرے میں تمیز کر سکتا ہے اور کسی سے ملتے وقت یا معاملہ کرتے وقت حفظ مراتب کا خیال رکھتا ہے۔ ایسے شخص کے کردار کی شائستگی اُس کی شخصیت میں حُسن پیدا کر دیتی ہے۔ ہر کوئی اُسے عزت و احترام کی نِگاہ سے دیکھتا ہے، اُس سے متاثر ہوتا اور اثر قبول کرتا ہے۔ اس کی باتوں میں شیرینی اور تاثیر ہوتی ہے۔ وہ ہر ایک کا ادب و احترام کرتا ہے کیونکہ:

"ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں"(۲۱)

اقبال کے نزدیک، تعلیم کا واحد اور حقیقی مقصد اس خودی کی پہچان، حفاظت اور استحکام ہے۔ جس تعلیم سے خودی کمزور یا ختم ہو جائے، وہ دراصل جہالت سے بھی بدتر ہے۔ خودی کی تربیت کے بغیر انسان ایک بے جان شے، ایک آلہ کار یا ایک ریوڑ کا حصہ بن کر رہ جاتا ہے۔ خودی کی حفاظت کے لیے اقبال نے تین مراحل بیان کیے ہیں، جو دراصل تعلیمی عمل کے بھی تین بنیادی ستون ہیں: اطاعت، ضبطِ نفس اور نیابتِ الٰہی۔ اطاعت کا مرحلہ یہ سکھاتا ہے کہ انسان فطرت اور شریعت کے اصولوں کے سامنے سر تسلیم خم کرے، کیونکہ یہ اصول اس کی اپنی ذات کے تحفظ کے لیے ضروری ہیں۔ ضبطِ نفس کا مرحلہ فرد کو اپنی خواہشات اور جذبات پر قابو پانے کی تربیت دیتا ہے، تاکہ وہ اندرونی انتشار کا شکار نہ ہو۔ اور نیابتِ الٰہی کا مرحلہ اسے اس قابل بناتا ہے کہ وہ کائنات کے اندر اللہ کے احکامات کو نافذ کرنے والا اور اس کی خلافت کا حق ادا کرنے والا بن جائے۔ لہٰذا، اقبال کے نظام میں تعلیم وہ عمل ہے جو فرد کو اطاعت گزار، خود مختار اور بالآخر خدا کا نائب بنا دے۔ خودی کے استحکام کے لیے اقبال نے علم (Knowledge) اور عمل (Action) کے ساتھ عشق (Spiritual Passion) کو لازم و ملزوم قرار دیا۔ ان کی نظر میں علم کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ علم جو انسان کو صرف مادی فائدہ پہنچائے اور اسے روحانی طور پر اندھا کر دے، اور دوسرا وہ علم جو بصیرت پیدا کرے اور خودی کو تقویت دے۔ وہ علم جو انسان کو صرف "دانش" دے مگر "بینش" نہ دے، وہ علم نہیں بلکہ فتنہ ہے۔

علم میں دولت بھی ہے، قدرت بھی ہے، لذت بھی ہے
ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ
اہل دانش عام ہیں کم یاب ہیں اہل نظر
کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا ایاغ(۲۲)

اقبال سائنس اور جدید علوم کے مخالف نہیں تھے، بلکہ وہ ان علوم کو روحانی اقدار کے تابع کرنے کے حامی تھے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ مسلمان جدید علوم کو پوری قوت سے حاصل کریں، مگر ان کا مقصد صرف دنیاوی تسخیر نہ ہو، بلکہ اس تسخیر کو اللہ کے احکامات کے مطابق استعمال کر کے انسانیت کی فلاح کا ذریعہ بنایا جائے۔ اس طرح، علم ایک پُل بن جاتا ہے جو مادی دنیا کو روحانی مقصد سے جوڑتا ہے۔ لیکن علم اکیلا کافی نہیں، اسے عشق کی حرارت کی ضرورت ہے۔ اقبال کے فلسفے میں عشق سے مراد محض جذباتی لگاؤ نہیں، بلکہ وہ روحانی تڑپ، وہ سوز اور وہ جنون ہے جو انسان کو عمل پر اکساتا ہے اور اسے ناممکن کو ممکن بنانے کی طاقت دیتا ہے۔ عشق ہی وہ قوت ہے جو علم کو عمل میں ڈھالتی ہے اور جمود کو توڑ کر تخلیقی جدوجہد کا راستہ کھولتی ہے۔ علم اگر "ذہن" کو

روشن کرتا ہے، تو عشق "دل" کو منور کرتا ہے۔

اقبال نے عشق کو خودی کی معراج قرار دیا، اور کہا کہ تعلیم کا طریقہ ایسا ہونا چاہیے جو طالب علم کے اندر جرات، ہمت اور عشقِ رسول و عشقِ الٰہی کا جذبہ پیدا کرے۔ خودی کا احساس و شعور عرفانِ الٰہی سے وابستہ ہے۔ اقبال کلمہ توحید یعنی لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کو خودی کا سرنہاں قرار دیتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک تعلیم انسان کے اندر خود آگہی کا جذبہ اسی صورت بیدار کر سکتی ہے کہ جب اس میں "جوہر لا الہ" کی رمق موجود ہو۔ چنانچہ اقبال کہتے ہیں کہ:

سرشت میں ہو لا الہ تو کیا خوف
تعلیم ہو گو فرنگیانہ (۲۳)

یہ عشق ہی ہے جو انسان کو فقر کی منزل تک لے جاتا ہے، جہاں وہ مادی آسائشوں سے بے نیاز ہو کر صرف اپنے مقصدِ حیات پر توجہ مرکوز کرتا ہے۔ فقر سے مراد درویشی یا دنیا سے کنارہ کشی نہیں، بلکہ استغنا اور خود انحصاری کی وہ حالت ہے جہاں انسان دنیاوی طاقتوں کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیتا ہے۔

اقبال عورت کی تعلیم پر بھی زور دیتے ہیں اور اسے قومی ترقی کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ تعلیم میں صنفی مساوات قائم ہو اور عورت کو علمی اور اخلاقی تربیت کے مساوی مواقع ملیں۔ بقول اقبال:

> "مرد کی تعلیم صرف ایک فردِ واحد کی تعلیم ہے مگر عورت کو تعلیم دینا حقیقت میں تمام خاندان کو تعلیم دینا ہے۔ دنیا میں کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی اگر اس قوم کا آدھا حصہ جاہل مطلق رہ جائے۔" (۲۴)

اقبال مغربی نظام تعلیم کے برعکس عورتوں کے لیے خالص مذہبی تعلیم اور خانہ داری اُمور سے متعلق تعلیم کو بنیادی حیثیت دیتے ہیں۔ بقول اقبال:

> "عورت کے دل و دماغ کو مذہبی تخیل کے ساتھ ایک خاص مناسبت ہے، لہذا قومی ہستی کی مسلسل بقا کے لیے یہ بات نہایت ضروری ہے کہ ہم اپنی عورتوں کو ابتداء میں ٹھٹھے مذہبی تعلیم دیں۔ جب وہ مذہبی تعلیم سے فارغ ہو چکیں تو اُن کو اسلامی تاریخ، علم تدبیر، خانہ داری اور علم اصولِ حفظ صحت پڑھایا جائے۔ اس سے ان کی دماغی قابلیتیں اس حد تک نشو و نما پا جائیں گی کہ وہ اپنے شوہروں سے تبادلہ خیالات کر سکیں اور امومت کے وہ فرائض خوش اسلوبی سے انجام دے سکیں جو میری رائے میں عورت کے فرائضِ اولین ہیں۔" (۲۵)

اقبال کے نزدیک تعلیم محض حصولِ معاش کا ذریعہ نہیں بلکہ انسان کی روحانی، اخلاقی اور فکری تربیت کا وسیلہ ہے۔ وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ تعلیم کا اصل مقصد انسان کے اندر خودی، شعورِ ذات، عملِ پیہم اور اخلاقی بالیدگی پیدا کرنا ہے۔ اقبال نے مغربی نظامِ تعلیم پر تنقید کرتے ہوئے واضح کیا کہ جب تعلیم کا مقصد صرف روزگار اور مادی ترقی رہ جائے تو انسان اپنے روحانی جوہر سے محروم ہو جاتا ہے۔ ان کے نزدیک علم وہ نہیں جو صرف عقل کو جلا دے بلکہ وہ ہے جو روح کو روشنی بخشے اور کردار کو استقامت دے۔ اقبال چاہتے تھے کہ تعلیم انسان کے اندر مقصدِ حیات کا شعور بیدار کرے تاکہ وہ اپنے علم کو قومی خدمت، دینی فلاح اور انسانی ترقی کے لیے استعمال کرے۔ ان کی فکر میں تعلیم کا رشتہ اخلاق، مذہب اور عمل سے ناقابلِ جدا ہے، اور یہی ہم آہنگی ایک صالح معاشرے کی بنیاد بنتی ہے۔ موجودہ دور میں فکرِ معاش نے انسان کو اپنی گرفت میں لے کر اسے محض مادی دوڑ کا حصہ بنا دیا ہے۔ بقول اقبال:

عصر حاضر ملک الموت ہے ترا جس نے
قبض کی روح تیری دے کے تجھے فکر معاش(۲۶)

اقبال اس رجحان کو روحانی زوال اور فکری غلامی قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک جب انسان کی تعلیم صرف معاشی فائدے تک محدود ہو جائے تو وہ اپنی خودی کھو بیٹھتا ہے۔ اقبال اس بات پر زور دیتے ہیں کہ فکرِ معاش ضروری ہے مگر اسے مقصدِ حیات پر غالب نہیں آنا چاہیے۔ معاش انسان کی بقا کے لیے اہم ہے لیکن جب یہ زندگی کا نصب العین بن جائے تو انسان اپنے اخلاقی، تخلیقی اور روحانی امکانات سے محروم ہو جاتا ہے۔ اقبال کے نظریات میں معیشت کو اخلاقی اصولوں، خودداری اور خدمتِ خلق سے وابستہ ہونا چاہیے۔ ان کے نزدیک حقیقی تعلیم اور درست فکرِ معاش وہ ہے جو انسان کو عبد بھی بنائے اور خلیفۂ ارض بھی، تاکہ وہ دنیا میں رہ کر بھی اپنے رب سے جڑا رہے اور اپنی قوم کے لیے باعثِ تعمیر بن سکے۔

انیسویں صدی میں یورپ میں تعلیم اور فکر پر مادیت کا غلبہ تھا۔ اس دور میں افادیت پسندی (Utilitarianism) کا رجحان فروغ پا گیا، جس کے مطابق ہر وہ شے بے کار سمجھی جاتی تھی جس کا عملی یا مادی فائدہ نہ ہو۔ علم کو محض صنعت، تجارت اور معاشی ترقی کا ذریعہ تصور کیا جانے لگا۔ تعلیم کا مقصد انسان کی روحانی و اخلاقی تربیت کے بجائے معاشی کامیابی قرار پایا۔ اس رجحان نے علم کے اعلیٰ اخلاقی و روحانی پہلوؤں کو پسِ پشت ڈال دیا، جس کے نتیجے میں انسان کی فکری وسعت محدود اور اس کی خودی مادیت کے تابع ہو گئی۔

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا رقم طراز ہیں:

"اُنیسویں صدی میں یورپ کے عقلیت پسند لوگ یہ سمجھنے لگے کہ جس چیز کا کوئی مادی فائدہ نہیں، وہ بے کار ہے۔ اس لیے تعلیم کا مقصد حصول علم کے بجائے دولت سمیٹنا قرار پایا۔"(۲۷)

تعلیم کا بنیادی مقصد حصولِ علم ہے، اور یہی علم انسان کی شرافت، عظمت اور برتری کا حقیقی سبب ہے۔ اقبال کے نزدیک علم محض معلومات کا ذخیرہ نہیں بلکہ وہ قوت ہے جو انسان کے باطن کو منور کرتی ہے، اس کی خودی کو بیدار اور اس کے شعور کو وسعت عطا کرتی ہے۔ علم انسان کے اندر وہ بصیرت پیدا کرتا ہے جس سے وہ خیر و شر کی تمیز کر سکے، اپنی زندگی کا مقصد پہچانے اور اپنی فکری و عملی صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکے۔ یہی علم انسان کو زمین و آسمان کے سربستہ رازوں کی دریافت تک پہنچاتا ہے، اسے کائنات کے حسن اور خالقِ کائنات کی حکمت کا ادراک عطا کرتا ہے۔ اقبال کے نزدیک علم کا حاصل صرف دنیاوی ترقی نہیں بلکہ معرفتِ الٰہی اور خودی کا عرفان ہے۔ یہی علم انسان کو احساس، شعور، اخلاق اور عمل کے اعلیٰ مدارج تک پہنچاتا ہے، جو فرد اور معاشرے دونوں کی تکمیل کا ضامن ہے۔

اقبال کے نزدیک سائنسی تعلیم محض تجربات یا مادی ترقی کا ذریعہ نہیں بلکہ کائنات کی روحانی حقیقتوں کو سمجھنے کا ایک راستہ ہے۔ وہ مسلمانوں کو بارہا اس بات کی تلقین کرتے ہیں کہ وہ علمِ سائنس کو محض مغربی تمدن کی نقل سمجھ کر رد نہ کریں بلکہ اسے اپنی دینی و فکری روایات کے ساتھ ہم آہنگ کریں۔

بقول خلیفہ عبدالحکیم:

"اقبال کی خواہش تھی کہ علم و فن یورپ سے حاصل کرو لیکن روحانیت اور خلاقیات کا جو سرمایہ تم کو اسلام نے دیا ہے، اس بیش بہا وراثت کی قدر کرو۔"(۲۸)

اقبال کے نزدیک اسلام نے سب سے پہلے انسان کو کائنات کی تسخیر اور مشاہدے کی دعوت دی، اس لیے سائنسی تحقیق دراصل قرآنی فکر کا تسلسل ہے۔ وہ اس امر کے قائل تھے کہ مسلمان جب تک علم و سائنس میں پیچھے رہیں گے، تب تک نہ فکری آزادی حاصل کر سکیں گے نہ تہذیبی خود مختاری۔ اقبال نے اس بات پر زور دیا کہ سائنسی علم کو دینی شعور کے ساتھ جوڑ کر حاصل کیا جائے، تاکہ علم انسان کو خالقِ کائنات کی معرفت تک پہنچا سکے۔ ان کے نزدیک سائنسی تعلیم کا اصل مقصد مادی تسخیر نہیں بلکہ روحانی بیداری اور فکری اجتہاد ہے، کیونکہ علم اگر ایمان سے خالی ہو تو تباہی کا پیش خیمہ بنتا ہے، لیکن جب وہ ایمان اور اخلاق سے منسلک ہو تو انسانیت کے لیے باعثِ تعمیر بنتا ہے۔

اقبال کے نزدیک تعلیم محض عقل کی تربیت نہیں بلکہ روح، اخلاق اور عمل کی ہم آہنگ پرورش کا نام ہے۔ ان کی نظر میں مثالی نظامِ تعلیم وہ ہے جو مذہب، علم اور صنعت کے درمیان توازن قائم کرے۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ اگر تعلیم سے روحانی بصیرت اور اخلاقی تربیت کا عنصر ختم ہو جائے تو علم انسان کے لیے تباہی کا سبب بن جاتا ہے۔ اقبال نے مسلمانوں کو تاکید کی کہ وہ دینی تعلیم کو اپنے تہذیبی تشخص کی بنیاد بنائیں اور ساتھ ہی جدید صنعتی و سائنسی علوم کو بھی اپنائیں تاکہ امت علمی، فکری اور معاشی طور پر خود کفیل ہو سکے۔ ان کے نزدیک مذہبی تعلیم انسان کو مقصدِ حیات کا شعور عطا کرتی ہے، جبکہ صنعتی تعلیم اسے عمل، ایجاد اور تعمیرِ ملت کا ہنر سکھاتی ہے۔ اقبال چاہتے تھے کہ مسلمان علم و عمل دونوں میں توازن پیدا کریں تاکہ وہ روحانی بلندی اور مادی ترقی کو یکجا کر سکیں۔ ان کے نزدیک تعلیم کا اصل ہدف ایسے افراد کی تشکیل ہے جو ایمان، عمل، علم اور اخلاق میں کامل ہوں، جو اپنی خودی کو پہچان کر نہ صرف اپنی قوم بلکہ پوری انسانیت کے لیے روشنی کا سرچشمہ بن سکیں۔

اقبال کے نزدیک تعلیم وہ قوت ہے جو فرد کی روحانی بیداری، اخلاقی تربیت، اور قومی تعمیر کا ضامن بنتی ہے۔ ان کی تعلیمی فکر میں مذہب، اخلاق، عقل اور عمل کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ اگر تعلیم سے ایمان اور روحانی بصیرت کو نکال دیا جائے تو وہ انسان کے لیے تباہی کا باعث بن جاتی ہے۔ اقبال کے نزدیک مذہبی تعلیم انسان کو خودی، مقصدِ حیات اور معرفتِ الٰہی کا شعور عطا کرتی ہے، جب کہ سائنسی و صنعتی تعلیم اسے عمل، ایجاد اور معاشی خود کفالت کی راہ دکھاتی ہے۔ وہ عورتوں کے لیے بھی ایسی تعلیم کے خواہاں تھے جو انہیں شعور، کردار اور عمل میں مرد کے ہم پلہ بنا سکے تاکہ وہ قوم کی فکری و اخلاقی تعمیر میں فعال کردار ادا کریں۔ اقبال نے تعلیم کو قومی معیشت کے استحکام اور تمدنی ارتقاء کی بنیاد قرار دیا، کیونکہ ان کے نزدیک مضبوط معیشت اسی قوم کو نصیب ہوتی ہے جس کے افراد باعمل، باایمان اور صاحبِ علم ہوں۔ وہ چاہتے تھے کہ تعلیم انسان میں خودی، آزادیِ فکر، اور خدمتِ خلق کا جذبہ بیدار کرے، تاکہ قوم مغربی تقلید کے بجائے اپنی تہذیبی شناخت کے ساتھ ترقی کی راہ پر گامزن ہو۔ اقبال کا تعلیمی فلسفہ ایک ہمہ گیر نظریہ ہے جو مذہب، اخلاق، سائنس، صنعت اور قومی بیداری کو ایک فکری وحدت میں پرو دیتا ہے۔

اقبال کی فکر کا عملی خاکہ نصاب، استاد اور طریقۂ تدریس کے تین اہم ستونوں پر کھڑا ہے۔ نصاب کے حوالے سے، ان کا سب سے بڑا مطالبہ توازن اور جامعیت کا تھا۔ وہ ایک ایسے نصاب کے حامی تھے جو دینی اور دنیاوی علوم کو الگ الگ خانوں میں تقسیم نہ کرے، بلکہ انہیں ایک کل کے طور پر پیش کرے۔ نصاب میں جدید سائنس، فلسفہ، تاریخ اور اسلامیات کو اس طرح شامل کیا جائے کہ طالب علم کائنات کے قوانین کو بھی سمجھے اور ان قوانین کے خالق کے ساتھ اپنے تعلق کو بھی پہچانے۔ خاص

طور پر تاریخ کو نصاب میں مرکزی حیثیت حاصل ہونی چاہیے، کیونکہ یہ ملت کو اس کی عظمتِ رفتہ سے جوڑتی ہے اور مستقبل کی ذمہ داریوں کا احساس دلاتی ہے۔ ادب اور شاعری کو بھی اہمیت دی جائے، کیونکہ یہ تخلیقی صلاحیتوں کو اجاگر کرتے ہیں اور روحانی اقدار کو دلوں میں راسخ کرتے ہیں۔ استاد کے بارے میں اقبال کا تصور سب سے زیادہ انقلابی ہے۔ ان کی نظر میں استاد محض ایک ملازم یا معلومات کا ترسیل کنندہ نہیں، بلکہ وہ روحانی معمار اور مرشد ہے۔ استاد کا کام صرف کتابیں پڑھانا نہیں، بلکہ طالب علم کی خودی کو بیدار کرنا اور اسے کردار سازی کا درس دینا ہے۔ ایک ایسا استاد جو خود اپنی خودی کو مستحکم نہ کر سکا ہو، وہ کبھی بھی ایک مضبوط کردار کی حامل نسل تیار نہیں کر سکتا۔ اقبال نے استاد کے لیے جرات، بصیرت اور اخلاص کو لازمی قرار دیا۔ استاد کو چاہیے کہ وہ طالب علم کے اندر سوال کرنے کی جرات، تنقیدی فکر اور تحقیق کا جذبہ پیدا کرے۔

طریقۂ تدریس کے حوالے سے اقبال رٹّا لگانے اور اندھی تقلید پر مبنی ہر طریقے کے سخت خلاف تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ تعلیم کا عمل تحقیقی، تخلیقی اور تجرباتی ہو۔ طالب علم کو صرف سننے والا نہیں، بلکہ عمل کرنے والا اور تجربہ کرنے والا ہونا چاہیے۔ تعلیم میں بحث و مباحثہ، تنقیدی تجزیہ اور عملی جدوجہد کو شامل کیا جائے۔ اقبال کے نزدیک، حقیقی علم وہ ہے جو انسان کو میدانِ عمل میں لے جائے اور اسے چیلنجز کا سامنا کرنے کے لیے تیار کرے۔ یہ طریقۂ تدریس طالب علم کے اندر خود اعتمادی، فیصلہ سازی کی صلاحیت اور تخلیقی قوت کو پروان چڑھاتا ہے۔ تعلیم کا ماحول ایسا ہونا چاہیے جو آزادئ فکر کو فروغ دے اور طالب علم کو اپنی رائے قائم کرنے اور اس پر ڈٹے رہنے کی ہمت دے۔ فکر اقبال کا حتمی مقصد ایک ایسی نسل کی تیاری ہے جو مومن کے اوصاف سے مزین ہو۔

مومن وہ مثالی انسان ہے جو اقبال کے فلسفے کی معراج ہے۔ یہ وہ فرد ہے جس کی خودی مکمل طور پر مستحکم ہو چکی ہے، جو علم اور عشق کے توازن سے آراستہ ہے، اور جو عملی جدوجہد کے ذریعے کائنات میں اللہ کی مرضی کو نافذ کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ مومن کی خصوصیات میں جرات، خودداری، استغنا، اور دوسروں کے لیے رحمت شامل ہیں۔ وہ نہ صرف دنیاوی طاقتوں سے بے خوف ہوتا ہے، بلکہ وہ اپنے علم اور عمل کے ذریعے دنیا کو ایک بہتر جگہ بنانے کا عزم رکھتا ہے۔ مومن کی تعلیم کا مقصد صرف اپنی ذات کی فلاح نہیں، بلکہ ملت کی فلاح اور انسانیت کی خدمت ہے۔ وہ خلافتِ ارضی کا حق ادا کرتا ہے، یعنی وہ دنیا کے وسائل کو ذمہ داری اور انصاف کے ساتھ استعمال کرتا ہے، اور کسی بھی قسم کے ظلم اور استحصال کے خلاف ڈٹ جاتا ہے۔ مومن کی تخلیق ہی اقبال کے تعلیمی انقلاب کا سب سے بڑا ثمر ہے۔

یہ اصلاحات صرف نصاب یا طریقۂ تدریس کی جزوی تبدیلیوں کا مطالبہ نہیں کرتیں، بلکہ یہ تعلیم کے بنیادی فلسفے کو

تبدیل کرنے کی دعوت دیتی ہیں۔ ان کا مقصد ایک ایسا انسان تیار کرنا ہے جو اپنی خودی کو پہچانے، علم کو عشق کی حرارت سے عمل میں ڈھالے، اور بالآخر مومن کے منصب پر فائز ہو کر دنیا میں عدل و احسان کا نظام قائم کرے۔ آج بھی، جب دنیا مادیت کے سیلاب اور روحانیت کے قحط کا شکار ہے، اقبال کا تصورِ تعلیم ایک مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کی تعلیمات میں وہ معنویت اور گہرائی موجود ہے جو ملتِ اسلامیہ کو اپنے کھوئے ہوئے مقام کو دوبارہ حاصل کرنے اور دنیا کی قیادت کے لیے تیار کر سکتی ہے۔ یہ نظامِ تعلیم اگر اپنی اصل روح کے ساتھ نافذ ہو جائے، تو یہ صرف مسلمانوں کے لیے ہی نہیں، بلکہ پوری انسانیت کے لیے فلاح اور نجات کا پیغام بن سکتا ہے۔

## حوالہ جات

1. Macaulaty, T.B., “Minutes on Education in India”, Cal., 1862, P:115.

۲۔ محمد اقبال، "ضربِ کلیم"، مشمولہ، "کلیات اقبال (اردو)"، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۷۳، ص، ۱۶/ ۴۷۸

۳۔ محمد آصف اعوان، ڈاکٹر، مغربی تہذیب کے مشرقی نقاد، بزم اقبال، لاہور ۲۰۱۲ء، ص ۱۱۶

۴۔ محمود حسین، ڈاکٹر، "خطباتِ محمود"، یونیورسل بکس، لاہور، ۱۹۸۳، ص ۱۱۰

۵۔ محمد اقبال، "مقالاتِ اقبال"، مرتبہ: سید عبد الواحد، آئینہ ادب، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۴۷

۶۔ محمد اقبال، "ضربِ کلیم"، مشمولہ: "کلیات اقبال (اردو)"، ص ۸۶/ ۵۴۸

۷۔ محمد اقبال، "بالِ جبریل"، مشمولہ: "کلیات اقبال (اردو)"، ص ۱۲۱/ ۴۱۳

۸۔ ایضاً، ص ۱۱۹/ ۴۱۱

۹۔ محمد احمد خاں، "اقبال اور مسئلہ تعلیم"، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۷۸ء، ص ۶۱

۱۰۔ "حیاتِ جوہر"، مرتبہ: عشرت رحمانی، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۵ء، ص ۴۴

۱۱۔ محمد اقبال، "ضربِ کلیم"، مشمولہ: "کلیات اقبال (اردو)"، ص ۸۱/ ۵۴۳

۱۲۔ محمد اقبال، "ضربِ کلیم"، مشمولہ: "کلیات اقبال (اردو)"، ص ۱۷۱/ ۶۳۳

۱۳۔ محمد اقبال، "بالِ جبریل"، مشمولہ: "کلیات اقبال (اردو)"، ص ۱۳۶/ ۴۲۸

۱۴۔ محمد اقبال، "بانگِ درا"، مشمولہ: "کلیات اقبال (اردو)"، ص ۲۰۹/ ۲۰۹

۱۵۔ عبد الواحد معینی، سید، "مقالاتِ اقبال"۔ آئینہ ادب، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۱۷۴

۱۶۔ محمد رفیق افضل، "گفتارِ اقبال"، ادارہ تحقیقات پاکستان، دانش گاہ پنجاب، لاہور، س ن، ص ۲۲۴

۱۷۔ محمد اقبال، "مقالاتِ اقبال"، ص ۱۷۳-۱۷۴

۱۸۔ محمد اقبال، "ضربِ کلیم"، مشمولہ: "کلیات اقبال (اردو)"، ص ۱۳۶/۴۲۸

۱۹۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، "اقبال سب کے لیے"، اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۷۸ء، ص ۱۱۳

20. Iqbal Review, Essay, "Educational Ideas of Iqbal". The Iqbal Academy Pakistan, Karachi, April, 1963, P:46

۲۱۔ محمد اقبال، "بانگِ درا"، مشمولہ: "کلیات اقبال (اردو)"، ص ۱۰۵/۱۰۵

۲۲۔ محمد اقبال، "بالِ جبریل"، مشمولہ: "کلیات اقبال (اردو)"، ص ۷۹/۵۴۱

۲۳۔ محمد اقبال، "ضربِ کلیم"، مشمولہ: "کلیات اقبال (اردو)"، ص ۸۷/۵۴۹

۲۴۔ محمد اقبال، "مقالاتِ اقبال"، ص ۹۳

۲۵۔ ایضاً، ص ۱۷۸-۱۷۹

۲۶۔ محمد اقبال، "ضربِ کلیم"، مشمولہ: "کلیات اقبال (اردو)"، ص ۸۳/۵۴۵

۲۷۔ خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر، "اکبر الٰہ آبادی- تحقیقی و تنقیدی مطالعہ"، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۱۷۸-۱۷۹

۲۸۔ عبدالحکیم، خلیفہ، ڈاکٹر، "فکر اقبال"، بزم اقبال، لاہور، ص ۱۸۲